

تفسیر "سورہ البقرہ" (آیات 41 تا 46)

<"xml encoding="UTF-8?">

"وَأْمِنُوا بِمَا أُنزِلَتْ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ - (41)

اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کیا ہے تصدیق کرتا ہوا اسکی جو تمہارے پاس ہے اور اس کے اول نمبر کے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کو ذرا سیقیمت پر ہاتھ سے نہ دیدو ورنہ پھر مجھ سے بچاؤ کی فکر کرو"

"اس پر جو اب نازل کیا ہے" اس سے مراد قرآن ہے اور "جو تمہارے پاس موجود ہے" اس سے مراد توریت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس نبی اور اسکی زبان پر کلام الہی اتارے جانے کی اطلاع تو خود توریت میں موجود ہے۔ یہ کتاب تو اسکی سچائی کا عملی ثبوت ہے تو تمہیں تو اس پر اول درجہ کا مومن ہونا چاہیئے نہ یہ کہ تم ہی اس کے اول درجہ کے کافر نظر آؤ۔

چونکہ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت اور قریش کی شکستوں کے بعد اب سب سے بڑے منکر قرآنی صداقت کے یہودی ہی نظر آرہے تھے اور واقعہ یہ تھا کہ وہ اس وقت اول درجہ کے کافر بنے ہوئے تھے اس لیے یہ کہا گیا کہ بجائے اول درجہ کے مومن ہونے کے تم اتنی شدت سے کافر کیوں ہو۔ یہ کوئی قید احترازی نہیں ہے جسکا مطلب یہ ہو کہ پہلے کافر نہ بنو دوسرے کافر ہوں تو کوئی حرج نہیں۔ (1)

اسی طرح یہ کہ "میری آیتوں کو ذرا سی ہاتھ سے نہ دیدو" اسکا مطلب بھی یہ نہیں کہ بہت قیمت ملے تو دیدو بلکہ واقعہ یہ تھا کہ علمائے اہل کتاب ذرا ذرا سے نفع کی خاطر احکام الہیہ میں تحریف کرتے تھے۔ تو ان کے عمل کی جو حقیقی صورت تھی اسکی رکاکت اور پستی دکھانے کے لیے یہ الفاظ صرف کیے گئے ہیں۔ پھر یہ کہ آیات الہیہ پر عمل میں جو بلند مفاد وابستہ ہے اس کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں جو بڑی سے بڑی قیمت بھی وہ حاصل کریں گے "ثمن قلیل" (2) ہی ہوگی۔

آخر میں "وایای فاتقون" کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس طرز عمل پر قائم رہو گے تو پھر تمہارے لیے میرے عذاب کا استحقاق یقینی ہے۔ اب اگر کرسکتے ہو تو اس سے بچاؤ کی فکر کرلو۔

**

"وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكُنُمُ الْخَلْقَ وَ أَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (42)۔

اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط نہ کرو اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو"

امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہما السلام نے نہج البلاغہ میں مندرج ایک کلام کے ذیل میں فرمایا ہے :

"فلوان الباطل خلص من مزاح الحق لم يحف على المرتادين ولو ان الحق خلص من الباطل انقطعت عنه السن المعاندين ولكن يؤخذ من هذا ضغث ومن هذا ضغث فيمزجان و يخرجانمعا فهتالك يستولى الشيطان على اوليائه"

اگر باطل حق کی آمیزش سے صاف ہوتو طلب گاروں پر پوشیدہ نہ رہے اور اگر حق باطل سے الگ ہو تو معاندين کی زبانیں اس پر نکتہ چینی سے بند ہو جائیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ایک مٹھا اُس کالیا جاتا ہے اور ایک مٹھا اِس کا اور دونوں کو ملا جلا دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک ساتھ سامنے لایا جاتا ہے، تو اب نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شیطان اپنے حوالی موالی پر قابو پا جاتا ہے "

مطلب یہ ہوا کہ نرا کھرا جھوٹ ہوتو اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا وہ جھوٹ جس میں سچائی کا شائبہ بھی شریک ہو۔ مخالف سیاست دان اکثر اسی طرح کا جھوٹ بولا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے مقابلہ میں ایسا ہی کرتے تھے مثلاً اہل کتاب کبھی یہ کہہ دیتے تھے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم پیغمبر بحق ہیں لیکن اولاد اسمعیل علیہ السلام اور قریش کے لیے ہیں۔ ہم سے کیا مطلب! اسکی صدائے بازگشت آجکل بعض تعلیم یافتہ اربابِ وطن کے دھن سے بلند ہوتی ہے ان الفاظ میں کہ ؛؛ محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم ملکِ عرب کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور سچے رسول تھے؛ یا کچھ نام نہاد مسلمان یہ کہتے ہیں کہ روزہ، نماز وغیرہ کے احکام عرب کے ماحول اور اس زمانہ کی فضا کے لحاظ سے تھے۔ اب ہم سے اُنکا تعلق نہیں ہے؛؛ ایسی ہی باتوں پر قرآن مجید نے یہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ "حق کو باطل سے نہ ملاؤ" (3)

"لبس" کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جن الفاظ میں حقیقت پنہاں ہے ان کے معانی بدل کر حقیقت کو مشتبہ بنایا جائے۔ اس میں علمائے اہل کتاب ید طولی رکھتے تھے۔ بشارتیں بعثتِ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ہزاروں لفظی تحریفوں کے باوجود بھی آج تک توریت اور انجیل میں موجود ہیں مگر علمائے اہل کتاب نے ان الفاظ کے معنی بدل کر اپنی جماعت کو باطل کے شکنجہ سے ہُمنے تک نہ دیا یہاں تک کہ وہ لفظ جس کے معنی "احمد" تھے اُسے ترجموں میں "تسلی دہندہ" سے تبدیل کر کے حقیقت سے دور کر دیا۔ یہی سلوک اس امت کے جمہور علماء نے خلافت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی نصوص کے ساتھ کیا اور اس طرح رسالت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم پر ایمان کے ادعاء کے ساتھ آپکی مسلسل تبلیغات و تعلیمات کو ٹھکرانے کا موقع پیدا کر لیا۔

پھر یہ جان بوجھ کر ہوتا ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ہر مذہب کے عوام تو سادہ لوح ہوتے ہیں اور خواص گرفتارِ اغراض ہوتے ہیں۔ عوام اکثر باطل کو نادانستہ اختیار کیے ہوئے ہوتے ہیں مگر علماء زیادہ تر حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے دھاندلیوں سے کام لیکر حق سے دور رہتے اور دوسروں کو بھی دور رکھتے ہیں۔ اسی کا قرآن نے ان الفاظ میں اظہار کیا ہے کہ "حق کو چھپاؤ نہیں جبکہ تم جانتے بھی ہو" اسی لیے خالق کے یہاں مواخذہ ان علماء سے عوام کی نسبت بہت زیادہ ہوگا جو ازروئے عدالت ان کے جان بوجھ اعراض کرنے کا صحیح نتیجہ ہے۔

**

"وَأَقِمْوُا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ٤ (43)۔"

اور نماز ادا کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور رکوع کرنیوالوں کے ساتھ رکوع کرتے رہو"

چونکہ ترتیبِ آیات کے لحاظ سے سیاق اس بات کا بتانا ہے کہ یہ خطاب یہود سے ہے اس لیے اس آیت کے ذیل میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ کیا کافروں کو فروع کا مخاطب بنانا درست ہے۔ (4)

ہمارے نزدیک یہ بحث اس لیے دورازکار ہے کہ ترتیبِ آیات موافق تنزیل نہیں ہے لہذا ہر آیت کو مستقل طور پر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے کیا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ سیاقِ آیت سے نتیجہ برآمد کرنا ہرگز درست نہیں ہے۔

اس آیت میں شریعتِ اسلام کے تین احکام کا ذکر ہے۔ پہلے "اقامتِ الصلوٰۃ" جسکی تشریح "یقیمون الصلوٰۃ" میں ہوچکی ہے۔ اسکا مطلب ہے ادائے نماز، دوسرے "ایتاءِ زکوٰۃ" یہ شریعتِ اسلام کا وہ حکم ہے جو اموال سے متعلق ہے یعنی کچھ خاص شرائط کے ساتھ ایک مال میں سے سال گزرنے پر کچھ مخصوص حصہ فقراء و مستحقین اور دیگر امورِ خیر کے لیے الگ کرنا۔ پہلا عمل انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرا مفادِ اجتماعی سے متعلق ہے۔

تیسرا حکم "رکوع کرنیوالوں کے ساتھ رکوع کرو" یہ نمازِ جماعت سے متعلق ہے۔ اس میں انفرادی عبادت میں اجتماعیت کو سمونے کی صورت ہے جو شریعتِ اسلام کی خاص خصوصیت ہے۔

اس میں رکوع کا ذکر بظاہر اس لیے ہے کہ نمازِ جماعت میں ادراکِ رکعت کا آخری موقع رکوع ہے جیسا کہ فقہ میں ثابت ہوا ہے اور اس صورت میں خطاب یہود سے ہو، رکوع کا خاص طور سے ذکر اس لیے بھی ہو سکتا ہے کہ یہود کے یہاں کی عبادت میں رکوع نہیں ہے۔ یہ ان کے بالمقابل اسلامی نماز کی خصوصیت امتیازی ہے۔ (5) مگر ہمیں اس میں تامل ہے، اس بنا پر کہ سورہ آل عمران میں جیسا کہ اس کے بعد آئیگا جناب مریم علیہا السلام سے خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے: "وارکعی مع الراكعين" اس سے پتہ چلتا ہے کہ شریعتِ موسوی کی نماز میں بھی رکوع جزءِ اہم تھا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بعد میں یہود نے شریعتِ موسوی کے اس حکم میں تنسیخ و ترمیم کر کے رکوع کو ساقط کر دیا ہو۔

**

"أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (44)۔"

کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم تو دیتے ہو اور خود کو بھول جاتے ہو حالانکہ تم کتابِ الہی پڑھتے رہتے ہو پھر بھی کیا عقل سے کام نہیں لوگے"

۴۴

یہ خطاب اصلاً علمائے یہود سے ہے۔ چونکہ مشرکین کو انکی علمی بلندی کا احساس تھا اس لیے اکثر وہ ان کے پاس آکر پیغمبرِ اسلام (ص) کے متعلق دریافت کرتے تھے اور یہ انکو اپنے علم کے مطابق یہ جواب دیتے تھے کہ بلاشبہ جو علامتیں ہماری کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب اس رسول (ص) میں پائی جاتی ہیں اس لیے اس پر ضرور ایمان لانا چاہیئے۔ یہ ہدایت وہ دوسروں کو کرتے تھے مگر خود اپنی کتاب کی تعلیم کے مطابق ایمان قبول نہ کرتے۔ اس سے انہیں اپنے جاہ و منصب کے تحفظ کا خیال مانع تھا کیونکہ موجودہ حالت میں تو اپنے مذہب میں وہ ایک پیشوا کی حیثیت رکھتے تھے لیکن اگر ایمان قبول کر لیتے تو انکی حیثیت پیروکار کی ہو جاتی بس اسی بے عملی پر قرآن کریم نے اس آیت میں متنبہ کیا ہے۔

"وانتم تتلون الكتاب" کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کو تو تمہارے واسطے تمہاری کتاب کے مندرجات پہنچتے ہیں اور تم اس کتاب کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اور زبان سے پڑھنے والے ہو۔ پھر کیا وہ تمہارے خلاف حجت نہ ہوگی؟ اور یہی اتمامِ حجت کا پہلو وہ ہے جس پر عقل کا حوالہ دیا ہے کہ سوچو تو خود تمہاری عقل بتائیگی کہ اس صورتِ حال میں ایمان نہ لانے پر ان لوگوں سے زیادہ تم موردِ الزام ہو اور مواخذہ کے زیادہ مستحق ہو۔

اب یہ تنبیہ چونکہ ایک عام اصولِ عقلی کے ماتحت ہے اس لیے وہ عمومی طور پر تمام عالمانِ بے عمل اور واعظانِ غیرمتعظ کو شامل و حاوی ہے۔ (6)

**

"وَاسْتَعِظُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَ إِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ ۖ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ (45) الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ وَإِنَّهُمْ لِنَالِهِ رَاجِعُونَ (46)"

اور سہارا لو صبر اور نماز کا اور یقیناً وہ گراں ہے مگر عظمتِ الہی سے متاثر دل رکھنے والوں کیلئے جنہیں خیال ہے کہ انہیں اپنے پروردگار کا سامنا کرنا ہے اور یہ کہ انہیں اسکی طرف رجوع کرنا ہوگا

؛؛؛

"سہارا" لینے کے حکم میں مشکلات کے پیش آنے کی خبر مضمّن ہے اور کوئی شک نہیں کہ ماحول کے تقاضوں کے خلاف حق کے راستے پر آنا دشواریوں سے خالی نہیں اور دشواریاں بھی ایسی جن کے مقابلہ سے خود اپنی مادی قوت قاصر ہے کیونکہ قوت قاصر نہ ہوتی تو سہارا لینے اور مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی مگر یہ مدد کسی دوسری مادی طاقت کی نہیں ہے بلکہ راہِ حق میں جو مشکلات درپیش ہوں ان کے مقابلہ میں مدد لی جائے تو بس ایک اندرونی قوت سے اس کا نام "صبر" ہے اور ایک بیرونی قوت سے جو پردہ غیب میں ہے اور اس سے مدد طلب کرنے کا طریقہ "صلوٰۃ" ہے۔

صبر کے اصل معنی برداشت کرنے کے ہیں اور انسان جتنی برداشت کی طاقت بڑھائیگا اتنی ہی مشکلیں آسان نظر آئیں گی۔

اسلام میں ایک عبادت یعنی "صوم" انسان کیلئے قوتِ برداشت کی مشق کے واسطے ایک بہترین ورزش کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے متعدد روایات میں صبر کی تفسیر صوم کے ساتھ ہوئی ہے۔ (7)

صبر یعنی قوتِ برداشت کے ذریعہ انسان سے استقلال اور ثباتِ قدم کا ظہور ہوگا اور اب صلوٰۃ کے ذریعہ سے خالق کی جانب رجوع کریگا تو توفیقِ ربانی اس میں پہلے تو مزید استقلال پیدا کریگی اور استقلال کے کمال کے ساتھ مشکلات کے دور ہونے کی صورتیں پیدا ہونگی

"وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا" (العنکبوت#29)

اسی لیے دوسری آیت میں صبر اور صلوٰۃ دونوں کو مرکزِ استعانت قرار دینے کے ساتھ پھر آخر میں انحصارِ صبر پر کر دیا ہے

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ" (البقرہ#153)

اور اس سے ظاہر ہے کہ صبر و استقلال کے معیار پر پورے اترنے کا ثبوت دیئے بغیر مددِ غیبی کا آسرا لگانا بیکار اور بالکل غلط ہے۔

مگر یہ صبر و صلوة سے سہارا لینا ہر انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ مادی ذہنیت والا آدمی تو ہر مشکل میں کسی مادی قوت ہی کا سہارا ڈھونڈھے گا اور جب نہ پائے گا تو یقین شکست کے ساتھ ہمت ہار جائیگا۔ یہ کام انہیں افراد ہے جن کے دل عظمتِ الہی سے متاثر ہوں اور اسی لیے ارشاد ہوا کہ

"و انہا لکبیرۃ الال علیالخاصعین"

اس احساس و عظمت کا نتیجہ اس خیال قائم ہونا ہے کہ آخر میں اُن کے معاملہ کا انحصار خالق کی مرضی پر ہے۔

یہاں لفظ "یظنون" صرف کی گئی ہے جو ادنیٰ درجہ اعتقاد کا پتہ دیتی ہے اور وہ اس لیے کہ انسان کے لیے خالق رجوع کا ظن بمعنی گمانِ غالب بھی مطلق العنانی ہے روکنے کے لیے کافی ہے لیکن جو صاحبانِ ایمان ہیں وہ اس سے بالاتر یعنی یقین کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ بھی ان الفاظ میں داخل ہے۔ یوں سمجھنا چاہیئے کہ لفظِ ظن اپنے سے کم درجوں کے مقابل میں ہے نہ کہ اپنے سے مافوق کے مقابل میں ، اس لیے یہ ظن بڑھ کر یقین کے درجہ پر پہنچ جائے تو وہ اس آیت کے خلاف نہ ہوگا بلکہ اس کا فردِ اکمل ہوگا اور اسی لیے روایات میں "یظنون" کی تفسیر "یوقنون" کے ساتھ کی گئی ہے۔ (8)

**

-
- (1). (اول کافر) اول من بعد من الکافرین وذلك لفاحش کفرکم بعد قیام الحجة علیکم من وجوه عديدة يقال لکثیر الکذب وشدید الفسق اول کاذب واول فاسق ای اول من بعد من الکاذبین ومن الفاسقین (البلاغی) لیس فی نہیۃ عن ان یكونوا اول کافر به دلالة علی انه یجوز ان یكونوا آخر کافر به. کما قال الشاعر : من اناس لیس فی اخلاقهم عاجل الفحش ولا سؤالجزع و لیس یرید ان فیهم فحشا أجلا (مجمع البیان)
 - (2). کل کثیر الیه قلیل وکل کبیر الیه حقیر (کشاف)
 - (3). وكان اعظمهم یقولون محمد نبی مبعوث الا انه مبعوث الی غیر نافذک خلطهم الحق بالباطل ولبسهم ایاہ به (طبری)
 - (4). فی هذاالخطاب مع الیهود دلالة علی ان الکفار مخاطبون بفروع الشرائع (نیشاپوری)
 - دوسرے گروہ کی طرف سے معقول جواب یہ ہے کہ آیت کے سارے احکام ایک قبل کے حکم ایمان "وامنوا بماانزل" کے ماتحت ہیں یعنی پہلے ایمان لاؤ اور پھر ان احکام پر عمل کرو (دریابادی)
 - (5). عبرعن الصلوة بالركوع احترازاعن صلوة الیهود (ابوالسعود)
 - (6). نزلت فی الخطباء والقصاص وهو قول امیرالمؤمنین علیہ السلام وهو علی کل منبر منهم خطیب مصقع کذب علی اللہ وعلی رسوله وعلی کتابہ اقول وہی جاریۃ فی کل من وصف عدلاوخالف الی غیرہ (صافی)
 - (7). فی الکافی والفقیہ والعیاشی عن الصادق علیہ السلام فی هذه الایۃ ان الصبر الصیام (صافی)
 - (8). فی التوحید والاحتجاج والعیاشی عن امیرالمؤمنین علیہ السلام یوقنون انهم یبعثون والظن منهم یقین (صافی)